انسانی جان اور جسم کے خلاف جرائم کی سزا

اسلامی قانون میں

(۲)

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

ترجمہ - معروف شاہ شیرازی

۲- قتل بالسببیت | کسی کے قتل کا سبب بننے کی ایک صورت یہ ہے کہ مثلاً گواہ کسی کے خلاف گواہی دیں کہ اس نے قتل کا ارتکاب کیا ہے اور ان کی شہادت کی بنا پر اُسے سزا ہو جاتے اور نفاذِ حکم کے بعد وہ اپنی شہادت سے رجوع کر لیں اور اقرار کر لیں کہ وہ اس شخص کو سزائے موت دلوانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے جان بوجھ کر اس کے خلاف جھوٹی گواہی دی - یا مثلاً جج کو یہ معلوم ہو کہ ملزم بے گناہ ہے لیکن وہ اُسے قصداً سزا دے اور بعد میں اعتراف کرے کہ اس نے جان بوجھ کر اُسے سزا دی -

---

(بقیہ تفہیم القرآن)

اٹھائے جائیں گے - یہ معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرات حسن بصری، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے بیان کیے ہیں - دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ آخرت کی رحمت و مغفرت سے اُسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر ہر خیر سے مایوس ہیں، کیونکہ انہیں اپنے مبتلائے عذاب ہونے کا یقین ہو چکا ہے - یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرات مجاہد، عکرمہ، ابن زید، کلبی، مقاتل اور منصور رحمہم اللہ سے منقول ہیں -

---

اس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ایک فریق کی رائے ہے کہ قاتل بالسببیت مثلاً گواہ،جج یا اس جیسے دوسرے لوگ جو اسی طرح قتل کے سبب بنیں،ان پر قصاص واجب نہیں ہے،کیونکہ یہ لوگ اگرچہ قتل کے اسباب فراہم کرتے ہیں لیکن یہ اسباب کسی شخص کو مجبور نہیں کر دیتے کہ وہ قتل کا شکار ہو۔مثلاً ایک شخص دوسرے کے لیے کنواں کھودتا ہے تو وہ اُسے مجبور نہیں کر دیتا کہ وہ شخص لازماً اس میں گرے۔پھر ان صورتوں میں نفاذِ قصاص میں مماثلت بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ قصاص میں تو سبب بننے والے کا قتل براہِ راست ہوگا حالانکہ جس قتل کا اُس نے ارتکاب کیا ہے وہ براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تھا۔علماء کا یہ گروہ بالارادہ براہِ راست قتل اور بالارادہ بالسببیت قتل کے درمیان فرق کرتا ہے اگرچہ اس کے نزدیک دونوں حالتوں میں قتل بالارادہ ہی ہے۔اس لیے پہلی صورت میں وہ قصاص کو واجب قرار دیتا ہے اور دوسری صورت میں واجب قرار نہیں دیتا۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ قاتل بالسببیت پر قصاص واجب ہے۔یہ رائے امام مالکؒ،امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کی ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ صورتوں میں گواہوں نے یا جج نے ایسے اسباب فراہم کر دیے تھے جن کے نتیجے میں قتل واقع ہو جاتا ہے اور ہو بھی گیا۔لہٰذا ان پر قصاص اسی طرح واجب ہوگا جس طرح قتل کرنے والے کے ساتھ قتل پر مجبور کرنے والے پر بھی قصاص واجب ہوتا ہے۔یہ لوگ یہ نظیر بھی پیش کرتے ہیں کہ قاسم بن عبدالرحمٰن کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے دو گواہوں نے ایک شخص کے خلاف چوری کی شہادت دی اور آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔اس کے بعد گواہوں نے اپنی شہادت سے رجوع کر لیا۔اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تم دونوں نے جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دی ہے تو میں تمھارے ہاتھ کاٹ دیتا۔لیکن چونکہ عمداً جھوٹی گواہی دینے کا کوئی ثبوت نہ تھا اس لیے آپ نے حکم دیا کہ وہ ہاتھ کی دیت ادا کریں۔اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کے نزدیک جو شخص قصداً کسی کا ہاتھ کٹوانے کے لیے جھوٹی گواہی دے اس نے گویا اس فعل کا ارادہ کیا جس کا نتیجہ ہاتھ کٹنا تھا،اور وہ نتیجہ رونما بھی ہو گیا،اس لیے اس پر قصاص واجب ہے کیونکہ وہ قصداً ایک انسان کا ہاتھ کٹنے کا سبب بنا ہے۔علاوہ بریں جن جرائم میں قصاص واجب ہوتا ہے وہ اکثر بالسببیت واقع ہوتے ہیں۔اب اگر ہم سزا کو صرف اسی مجرم تک محدود کر دیں جس نے براہِ راست جرم کا ارتکاب کیا۔اور بالسببیت جرم

کرنے والے سے قصاص نہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجرمین براہِ راست قتل کے بجائے بالسببیت قتل کا راستہ اختیار کریں گے اور قانونِ قصاص معطل ہو جائے گا۔[1]

خلاصہ یہ کہ امام ابوحنیفہؒ بالارادہ قتل بالسببیت میں قصاص کو واجب نہیں سمجھتے، اور فقہاء کی اکثریت اس نوعیت کے قتل کو موجبِ قصاص سمجھتی ہے۔ میں اسی دوسری رائے سے اتفاق رکھتا ہوں کیونکہ بالسببیت قتل کا موجب بننے والا وہ کام کرتا ہے جس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے نتیجہ میں اغلباً قتل واقع ہو جایا کرتا ہے، اس لیے وہ اس آلہ کے مشابہ ہے جس کے استعمال سے عادۃً قتل رونما ہوتا ہے، اور ایسے آلہ سے جب قتل واقع ہو تو فقہاء کی اکثریت اسے موجبِ قصاص مانتی ہے۔

۳۔ جبکہ مقتول قاتل کا جزء ہو: اگر مقتول قاتل کا جزو ہو، یعنی وہ قاتل کی اولاد میں سے ہو، مثلاً قاتل باپ ہو یا باپ کے حکم میں ہو اور وہ بیٹے کو قتل کر دے۔ یا قاتل ماں ہو یا ماں کے حکم میں ہو اور وہ اپنے بچے کو قتل کر دے تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام ثوریؒ کے نزدیک ایسے قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے لا یقاد الوالد بولدہٖ "والد سے بیٹے کا قصاص نہ لیا جائے گا" اور عادۃً ایسا نہیں ہوتا کہ ماں یا باپ اپنی اولاد کو قتل کر دیں، کیونکہ فطری طور پر ان کے اندر اولاد کے لیے شفقت ہوتی ہے۔ اس لیے اس معاملہ میں شبہ کا موقع پیدا ہو جاتا ہے اور شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے۔ مزید برآں باپ چونکہ بیٹے کی زندگی کا سبب ہوتا ہے لہٰذا وہ بیٹے کی وجہ سے قتل نہ ہوگا۔ یہی حکم ماں، دادا، دادی، نانا اور نانی کا بھی ہے کہ وہ باپ کے درجہ میں ہیں اور بیٹے یا پوتے یا نواسے کا قصاص ان سے نہیں لیا جا سکتا۔[2] اور ایسی حالت میں

---

[1] بدائع الصنائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۹۔ اسنی المطالب، ابو یحییٰ زکریا الانصاری الشافعی، ج ۴، ص ۵ اور اس کے بعد، طبع ۱۳۱۳ھ مطبع میمنیہ، مصر۔ مواہب الجلیل، ج ۶، ص ۲۴۱، طبع اول ۱۳۲۹ھ، مطبع السعادۃ مصر۔ المغنی، ابن قدامہ، ج ۹، ص ۳۳ اور اس کے بعد۔ التشریع الجنائی الاسلامی عبدالقادر عودہ ص ۵۵۴-۵۶۔

[2] الکاسانی ج ۷، ص ۲۳۵۔ تبیین الحقائق شرح الکنز، امام زیلعی جلد ۶ ص ۱۰۵۔ الاحکام السلطانیہ الماوردی ص ۲۲۰۔

بھی قاتل سے قصاص نہیں لیا جا سکتا جبکہ مقتول کے وارثوں میں سے کوئی قاتل کے فروع میں سے ہے، کیونکہ قاتل کے اس فرع کی طرف سے قصاص واجب نہیں ہوتا، اور قصاص ایسی سزا ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے مقتول کے تمام وارثوں کے حق میں صرف دیت واجب ہوگی[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ باپ یا دادا اگر بیٹے یا پوتے کو تلوار اور لاٹھی سے قتل کردیں تو اس صورت میں قصاص نہیں ہوگا لیکن اگر وہ اُسے لٹا کر ذبح کردیں تو قصاص ہوگا[2]۔

وہ مقتول جو مطلقاً معصوم الدم نہ ہو | اگر شخص متضرر معصوم الدم نہ ہو تو اس کے قاتل سے بھی قصاص نہ لیا جائے گا۔ مثلاً کسی ملک کا مسلم باشندہ یا غیر مسلم ذمی کسی حربی کافر یا مرتد کو قتل کر دے، یا کوئی وفادار شہری کسی باغی کو قتل کر دے[3]۔ ایسے مقتول چونکہ معصوم الدم نہیں ہیں، اس لیے ان کے قتل ہو جانے پر قصاص واجب نہ ہوگا۔ نیز

---

[1] الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۵۔

[2] بدایۃ المجتہد، ابن رشد، طبع اوّل ۱۳۲۹ھ، ج ۲ ص ۳۳۶-۳۳۵۔ ابن رشد کہتے ہیں: امام مالکؒ اور جمہور کے درمیان اختلاف رائے کا سبب وہ حدیث ہے جو حضرت عمروؓ بن شعیب سے مروی ہے کہ بنی مدلج کے ایک شخص قتادہ نے اپنے بیٹے کے تلوار گھونپ دی جس سے اس کی پنڈلی زخمی ہوئی اور زخم سے اس قدر خون بہا کہ وہ مرگیا۔ اس پر سراقہ ابن جعشم حضرت عمر بن خطاب کے پاس آئے اور ان کے سامنے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے مقتول کے بھائی کے حق میں سو اونٹ دیت کا حکم دیا جس میں سے تیس[3] سہ سالہ، تیس چہار سالہ اور چالیس پنج سالہ ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان دہرایا کہ "دیت میں سے قاتل کسی چیز کا حقدار نہیں ہے"۔

امام مالکؒ کی رائے میں یہ قتل خالص قتل عمد نہ تھا بلکہ ان کے نزدیک اس امر میں شبہ تھا کہ آیا باپ نے عمداً قتل ہی کی نیت سے بیٹے کو تلوار ماری تھی یا اس کی یہ نیت نہ تھی لیکن جمہور فقہاء اسے عمد ہی قرار دیتے ہیں، کیونکہ ان کا اجماع ہے کہ اگر کوئی کسی کو تلوار مارے اور وہ شخص مرجائے تو یہ قتل عمد ہوگا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایسے حالات میں جو قتل ہوگا جبکہ وہ دھوکے سے بھی ہو، تو قاتل پر قتل بالارادہ کا حکم گمان غالب کی بنا پر اور اس مفروضے پر لگایا جاتا ہے کہ ایک غیر آدمی کو مقتول سے کوئی محبت نہیں ہو سکتی، اور نیتوں کا حال صرف اللہ ہی کو معلوم ہوتا ہے مگر جب اس قتل کا مرتکب مقتول کا اپنا باپ ہو تو چونکہ وہ بیٹے سے قدرتی محبت رکھتا ہے اور اُسے حق تادیب بھی حاصل ہوتا ہے اس لیے اُسے ایک اجنبی کی طرح متہم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے امام مالکؒ اس قتل کو قتل عمد قرار نہیں دیتے۔ اسی کتاب میں مسلک ظاہری کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ باپ سے بیٹے کا قصاص لیا جائے۔

[3] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔

اگر ایک باغی شخص ایک وفادار شہری کو قتل کر دے تو بھی باغی سے قصاص نہ لیا جائے گا کیونکہ باغی کے خیال میں یہ شہری معصوم الدم نہیں ہے۔ اگرچہ اس باغی کی رائے فاسد دلائل پر مبنی ہے لیکن باغی اگر پرشوکت (POWERFULL) ہو (یعنی مضبوط جتھا رکھتا ہو) تو وجوب ضمان کے معاملے میں اس کی اس باطل تاویل کو بھی صحیح تاویل کے درجے میں سمجھا جائے گا۔[1]

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اگر مستامن حربی (یعنی دشمن کے علاقے سے دارالاسلام میں امان لے کر آنے والے شخص) کو قتل کر دے تو اس سے بھی قصاص نہ لیا جائے گا۔ کیونکہ اگرچہ مستامن معصوم الدم ہے لیکن اس کا معصوم ہونا ایک محدود وقت کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے اس کا خون محفوظ نہیں ہے، اس لیے اس کا خون دارالاسلام کے باشندے کے خون کے برابر نہیں ہے کہ ایک کا بدلہ دوسرے سے مساوی طور پر لیا جائے۔ نیز یہ شخص چونکہ دوبارہ دارالحرب کی طرف لوٹنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے ہوسکتا تھا کہ اس کا کفر اُسے مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرتا۔ لہٰذا ایک حربی مستامن کے خون کی عصمت میں عدمِ عصمت کا شبہ واقع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قاتل سے قصاص ساقط ہو جائے گا۔

لیکن امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ کیونکہ جرم کے ارتکاب کے وقت شخص متضرر کا خون معصوم تھا، وہ امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا تھا اور امان کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کا خون معصوم ہو۔[2] میرے خیال میں امام ابویوسفؒ کی رائے زیادہ قابلِ ترجیح اور لائق قبول ہے۔

امام محمدؒ سے یہ قول مروی ہے کہ اگر ایک مستامن دوسرے کو قتل کر دے تو اس صورت میں بھی قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا۔[3]

<u>خون میں عدم مساوات</u> | قصاص کے نفاذ کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مقتول اور قاتل دونوں کا خون برابر ہو،

---

[1] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔

[2] السرخسی، ج ۲۶، مطبع السعادۃ قاہرہ، ص ۱۳۱ اور اس کے بعد۔ الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔ شرح فتح القدیر، ج ۸، ص ۲۵۶ اور اس کے بعد، طبع اول ۱۳۱۶ھ، مطبع امیریہ بولاق مصر۔ شرح الکنز، زیلعی، ج ۶، ص ۱۰۲ اور ۱۰۵۔

[3] الکاسانی، ج ۷، ص ۲۳۶۔

یعنی دونوں کی جان کی قیمت ہمارے قانون کے نقطۂ نظر سے مساوی ہو۔ فقہاء نے قاتل اور مقتول کے خون میں عدم مساوات کے چار اسباب بیان کیے ہیں:

۱۔ اسلام اور کفر

۲۔ آزادی اور غلامی

۳۔ صنف کا اختلاف (یعنی مرد و عورت کا اختلاف)

۴۔ وحدت اور کثرت کا اختلاف

جب قاتل اور مقتول ان چاروں چیزوں میں مساوات رکھتے ہوں تو بالاتفاق قصاص واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر دونوں کے درمیان ان میں سے کوئی اختلاف موجود ہو تو قصاص کے وجوب میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمّی کو قتل کر دے تو بعض فقہاء کی رائے میں مسلم کو بطور قصاص قتل نہ کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ، امام ثوریؒ، امام احمدؒ اور داؤد ظاہری اسی رائے کے قائل ہیں۔ لیکن بعض دوسرے فقہاء کی یہ رائے ہے کہ مسلمان کو ذمّی کے بدلے بطور قصاص قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ اسی طرف گئے ہیں۔ امام مالکؒ اور لیثؒ بن سعد کہتے ہیں کہ مومن کو ذمّی کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا الّا یہ کہ مسلمان نے ذمّی کو بے دردی سے قتل کر دیا ہو۔ ان کے نزدیک بے دردی کا مفہوم یہ ہے کہ اُسے لٹا کر ذبح کیا گیا ہو، خصوصاً جبکہ اس فعل کا محرک مقتول کا مال لینا ہو۔

جو لوگ قصاص کے قائل نہیں ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ "مومن کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے"۔ یہ حدیث عمرو بن شعیب نے بھی اپنے باپ اور دادا کے واسطہ سے نقل کی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ہم خیال اُس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبلہ میں سے ایک شخص کو ایک ذمّی کے بدلے قتل کیا اور فرمایا کہ یہ بات سب سے بڑھ کر میرے لائق ہے کہ میں عہد کا پابند رہوں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ جس حدیث میں ارشاد ہوا ہے

کہ "کوئی مسلم کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔" اس میں اگرچہ کافر کا لفظ عام ہے مگر یہ حدیث اسے کافر حربی کے معنی میں مخصوص کر دیتی ہے اور ذمی اس کے حکم سے خارج ہو جاتا ہے۔ نیز وہ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کوئی مسلم ذمی کا مال چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتے۔ لہٰذا قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ جب ذمی کا مال مالِ مسلم کے برابر ہے تو اس کی جان بھی ایک مسلم کی جان کے برابر ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا مسلک ہی درست ہے۔ اگر ذمی کے خون کی حرمت ہی نہ ہو تو پھر عقدِ ذمہ کے معنی آخر کیا رہ جاتے ہیں؟ نیز اہلِ ذمہ دار الاسلام کے شہری ہیں۔ ان کے حقوق وہی ہیں جو ہمارے ہیں ——— اور ان کی ذمہ داریاں وہی ہیں جو ہماری ہیں۔

۲۔ اگر مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ وہ عورت کے بدلے قتل نہ ہوگا۔ لیکن یہ رائے بھی جمہور فقہاء کی آراء کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح ایک عورت کسی مرد کو قتل کرنے کے جرم میں قتل کی جائے گی بحیثیت انسان دونوں مساوی ہیں اور دونوں کی جان یکساں محترم ہے۔

۳۔ اگر کچھ لوگ مل کر ایک شخص کو قتل کر دیں تو داؤد اور اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ ایک شخص کے بدلے کئی شخصوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآن مجید کا حکم ہے اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، یعنی "جان کے بدلے جان"۔ لیکن جمہور فقہاء نے اس رائے کو بھی رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مقتول کے بدلے قاتلوں کی پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ یہی رائے حضرت عمرؓ کی تھی۔ صنعاء کے ایک مقتول کے مقدمے میں انہوں نے فرمایا کہ اگر اہلِ صنعاء سب کے سب اُس پر حملہ آور ہوئے ہوتے اور اُسے قتل کر دیتے تو میں سب کو اس ایک کے بدلے قتل کر دیتا۔ نیز مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک مقتول کے بدلے متعدد قاتلین کو قتل کیا جائے۔ شریعت نے قصاص کا حکم جس مقصد کے پیشِ نظر دیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ارتکابِ قتل سے باز رہیں۔ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیَاۃٌ یَا اُولِی الْاَلْبَابِ "عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے"۔ اگر ایک مقتول کے متعدد قاتلین پر سے قصاص ساقط کر دیا گیا تو مجرمین اجتماعی شکل میں قتل کا ارتکاب کر کے قصاص سے بچ نکلیں گے اور وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے شارع نے قانون بنایا تھا۔[1]

[1] قاتل و مقتول کے خون کے درمیان مساوات، اس کی شرائط، ہر شرط کے لیے بیان کردہ تفصیلی دلائل اور فقہاء کی آراء کے لیے

میرے نزدیک جمہور کی رائے ہی قابلِ قبول ہے۔ کیونکہ جب مجرم متعدد ہوں تو ہر ایک کے دل میں قتل کا ارادہ پایا جاتا ہے، اور متضرر کی موت سب کے فعل کی وجہ سے واقع ہوتی ہے، اور شرائط قصاص ہر ایک کے بارے میں پوری ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی کو محض اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ جرم میں کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ شریک تھے۔ بلکہ متعدد افراد کا جرم میں شریک ہونا ارتکابِ جرم کے لیے اور ممد و معاون ہو جاتا ہے اور ایسی صورتوں میں بالعموم جرم کا ارتکاب زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی سزا ایسی عبرتناک ہونی چاہیے جو لوگوں کو اس فعل کے ارتکاب سے باز رکھنے والی ہو۔

خون کی معافی | قصاص کا مطالبہ مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ اور خون کی معافی کا حق بھی انہی کو پہنچتا ہے خواہ وہ دیت لے کر معاف کریں یا بلا معاوضہ معاف کر دیں۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر اولیائے مقتول قصاص معاف کر دیں تو وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فمن عُفِیَ له من اخیه شیءٌ فاتباع بالمعروف واداءٌ الیه باحسان "پھر اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو چاہیے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔" (۲:۱۷۸) اور حدیث میں آتا ہے کہ العمد قود الا ان یعفو ولی المقتول "قتل عمد میں قصاص ہے الا یہ کہ مقتول کا ولی معاف کر دے۔" اس لیے اگر مقتول کے ورثاء خون معاف کر دیں تو قاضی قصاص کا حکم نہیں دے سکتا، کیونکہ معافی سے قصاص لازماً ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر قصاص ساقط ہو جائے خواہ اس کے بدلے دیت لی جائے یا دیت بھی معاف کر دی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں قاتل کو بغیر کسی سزا کے چھوڑ دیا جائے گا، یا اُسے کوئی سزا دی جائے گی؟ اس مسئلے پر ہم ان شاء اللہ عنقریب بحث کریں گے۔

۴۔ ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابن رشد، ج ۲ ص ۳۲۳-۳۲۵۔ الاحکام السلطانیہ الماوردی، ص ۲۱۹-۲۲۰۔